CONVERSATIONS WITH

TARIQ ALI

SPEAKING OF EMPIRE AND RESISTANCE

سامراج اور مزاحمت

طارق علی سے انٹرویو

ڈیوڈ برسمین ترجمہ: ارشد رازی

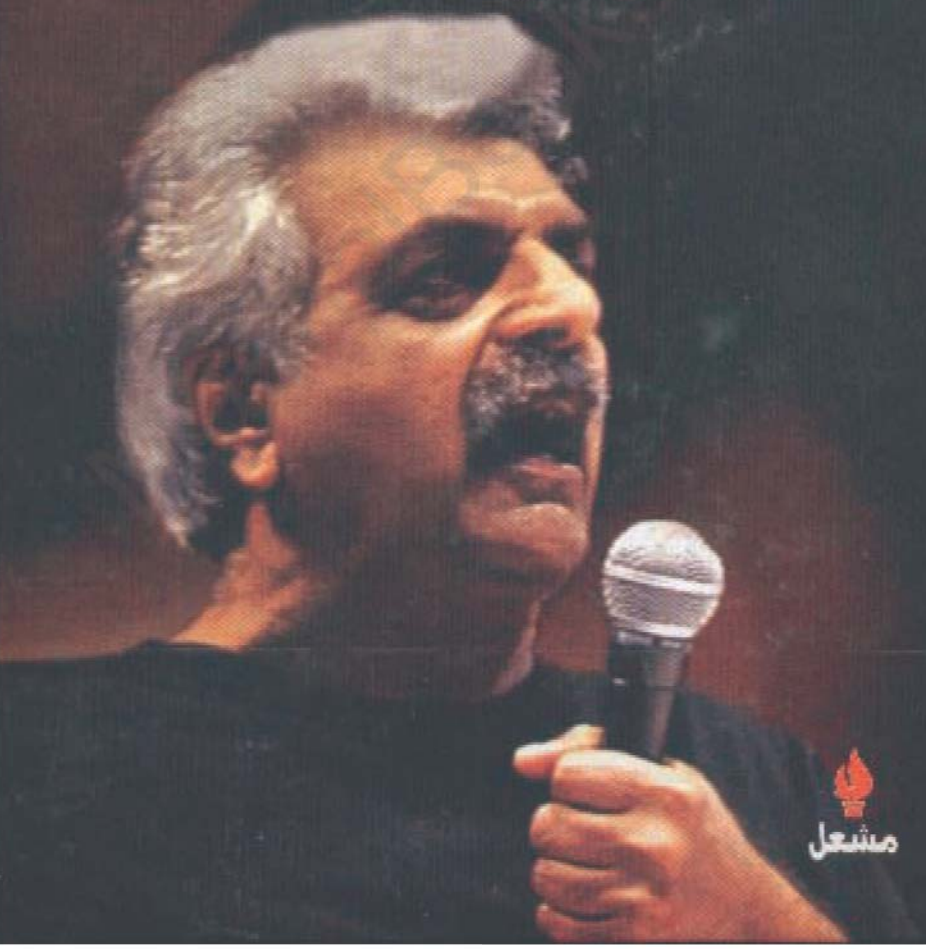

مشعل

فہرست

سامراج کی واپسی	7
سامراجیت ... تب اور اب	14
بش ــــ بابل میں	37
سامراج میں شگاف	53
پاکستان ــــ جنرلوں کی حکومت	71
سامراج کے علمی ستون	89
فلسطین اور اسرائیل	122
پس لفظ	150

MashalBooks.com

MashalBooks.com

1

سامراج کی واپسی

ایک بار ایک پاکستانی جنرل نے آپ سے کہا تھا، ''پاکستان ایک کنڈوم کی طرح ہے اور افغانستان میں داخل ہونے کے لیے امریکیوں کو اس کی ضرورت تھی۔ ہم نے یہ مقصد پورا کر دیا اور اب وہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں فلش میں بہایا جا سکتا ہے۔ اَسّی کے عشرے میں پاکستان اور امریکہ نے ملحد سوویت یونین کو شکست دینے کے لیے مجاہدین کو مالی امداد دی اور مسلح کیا۔ کیا پاکستان کو ایک بار پھر بطور کنڈوم استعمال کیا جا رہا ہے؟

□ میرا خیال ہے کہ امریکیوں نے وہی کنڈوم پھر ڈھونڈ نکالا لیکن دیکھا تو اس میں بہت سے سوراخ ہو چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک نیا کنڈوم مہیا کیا اور پھر انہوں نے چڑھائی کر دی۔ اس بار وہ پاکستانی فوج کو استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ اس نے ہی طالبان کو بنایا اور اسے فتح دلوائی تھی۔ ان سے خود اپنی اولاد کو قتل کرنے کی توقع مشکل تھی۔ چنانچہ امریکہ نے پاکستانی فوج کو مجبور کیا کہ طالبان کی پشت پناہی ختم کر دے۔ فوج اس کام پر بڑے تذبذب کے بعد آمادہ ہوئی۔ لیکن اسے یہ کرنا ہی پڑا۔ پاکستانی فوج کا سہارا ختم ہوا تو طالبان تاش کے پتوں کی طرح بکھر گئے۔ اگرچہ ان کا نسبتاً ایک زیادہ راسخ گروہ کچھ دیر تک پہاڑوں میں جدوجہد جاری رکھے گا لیکن ان کا اسلام آبادی طبقہ وہی کرے گا جس کا حکم ملے گا اور بوقت ضرورت غالباً امریکہ کے زیر استعمال بھی آئے گا۔

زیادہ تر امریکیوں کو طالبان کے لیے پاکستانی اور امریکی پشت پناہی کی تاریخ کا علم نہیں۔ آپ نے پچھلے ستمبر میں کہا تھا، ''لوگوں کو تاریخ فراموشی سکھائی جاتی ہے۔'' اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟

MashalBooks.com

□ کمیونزم کے انہدام اور سوویت یونین کے زوال کے بعد سے مغرب میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں کلچر تاریخ کے مضمون کو تباہ کرنے پر متفق چلے آ رہے ہیں۔ لگتا ہے گویا تاریخ کو ختم کیا جا رہا ہے۔ یعنی ماضی میں کچھ زیادہ ہی معلومات موجود ہیں چنانچہ بہتر ہے اسے فراموش کرتے ہوئے از سر نو آغاز کیا جائے۔ لیکن جیسا کہ ہر ایک پر واضح ہو رہا ہے کہ تاریخ کے ساتھ یہ نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخ گمنام ہونے کو تیار نہیں۔ اگر آپ اسے دبانے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ خوفناک انداز میں واپس آ جاتی ہے۔ اصل میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔

مغربی فکر کی ایک بہت بڑی ناکامی یہ ہے کہ ایڈولف ہٹلر کے سوا انہیں اپنا کوئی دُشمن نظر نہیں آتا۔ اس طرزِ فکر کا آغاز 1956 کی جنگ سویز میں ہوا تھا جسے میں تیل کی پہلی جنگ کہا کرتا ہوں۔ اس وقت کے برطانوی وزیراعظم انتھونی ایڈن نے قوم پرست مصری رہنما جمال عبدالناصر کو مصری ہٹلر قرار دیا تھا۔ پھر معاملات اسی نہج پر آگے بڑھتے رہے۔ جب صدام حسین مغرب کا دوست نہ رہا تو اسے بھی ہٹلر قرار دے دیا گیا۔ اسی طرح ملوسیوچ بھی ہٹلر بن گیا۔ کروشیائی فاشسٹوں اور اس ہٹلر کے لیے بوسنیا اور کوسوو کے لڑنے والے ایس ایس دستوں کا ذکر تک نہیں ہوتا۔ اب القاعدہ اور طالبان کو اسلامی فاشسٹ بتایا جا رہا ہے۔ زور اس امر پر ہے کہ اسامہ بن لادن ہٹلر ہے حالانکہ اس کے پاس کوئی ریاستی قوت سرے سے موجود نہیں۔ اگر آپ ذرا سنجیدگی سے غور کریں تو دعوے کی غرابت سامنے آ جائے گی۔ درحقیقت اس افغان گیم میں شامل واحد کھلاڑی جس نے نازیوں کے لیے نرم گوشے کا اظہار کیا ظاہر شاہ ہے جو جنگ عظیم دوم کے دوران افغان تخت پر تھا۔ اسے امید تھی کہ نازی ہندوستان میں برطانیہ کو شکست دیں گے اور ہونے والی تاخت و تاراج کا کچھ حصہ اسے بھی ملے گا۔

اس طرح کے مضحک استدلال کو مانتے چلے جانے کی ایک ہی وجہ ہے کہ تاریخ کو کلیتاً نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ مغرب کی آبادی نہایت زود فراموش ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ پچھلے پندرہ برس میں ٹیلی ویژن پر دنیا کی کوریج زوال پذیر ہے اور دوسری طرف ایک خاص نظریئے کے گرد گھومنے والی فلموں کے سلسلے اور جنگ عظیم دوم پر دستاویزی فلموں کی بھرمار ہوئی ہے۔ ان امور کا احاطہ کرنے والی تاریخ اگرچہ پرانی ہے اس کے باوجود آج بھی سنسنی خیز ہے۔ ٹیلی ویژن نے حالیہ تاریخ کو مکمل طور پر نظر انداز کر رکھا ہے۔ اگر آپ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ٹیلی ویژن چینلوں کو دیکھیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ باقی دنیا کو دی جانے والی کوریج نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان پر تو میکسیکو یا لاطینی امریکہ جیسے ہمسایہ ممالک کو بھی

نظرانداز کیا جا رہا ہے۔ اس طرح کی بے خبری جنگ کے زمانے میں بڑی مفید ثابت ہوتی ہے کیونکہ عوام کو کسی بھی وقت فوری اشتعال میں لا کر کسی بھی ملک کے خلاف جنگ چھیڑی جا سکتی ہے۔ یہ سارا عمل بہت خوفناک ہے۔

بیسویں صدی کی آخری جنگوں کو اکیسویں صدی کی پہلی جنگ کے تقابل میں کیوں کر دیکھا جا سکتا ہے؟

□ ایک فرق تو یہ ہے کہ پچھلی جنگیں حقیقی حلیفوں کے مابین لڑی گئیں۔ آج اتحادوں میں امریکہ غالب قوت ہے۔ لیکن اسے اپنے ساتھ کھڑے ہونے والے لوگوں کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر کوسووا اور خلیج دونوں جنگوں میں آگے بڑھنے سے پہلے امریکہ کو دوسروں کے اتفاق رائے کی ضرورت تھی۔ اکیسویں صدی کی پہلی جنگ یعنی جنگ افغانستان میں امریکہ نے ہمسایہ علاقوں پر پڑنے والے اثرات یا کسی بھی دوسرے امر کی پروا کیے بغیر من مانی کی۔ میرا خیال ہے کہ اسے اثرات کی کوئی پروا نہیں بصورت دیگر وہ شمالی اتحاد کی طرف سے یوں آنکھیں بند نہ کرتا۔ امریکہ نے شمالی اتحاد والوں کو طالبان جنگی قیدیوں کی ہلاکت کا حکم دیا۔ یہ جنگ کے تمام معاہدوں کی خلاف ورزی ہے۔ مغربی ٹیلی ویژن نے ان ہلاکتوں کو کوریج نہ دی لیکن عرب نیٹ ورک قیدیوں کا یہ قتل عام دکھاتے رہے۔ ہمیں تو وہی کچھ دکھایا جاتا ہے جسے مغربی ذرائع ابلاغ کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔

آئیڈیالوجی کے استعمال کے حوالے سے یہ سب جنگیں ایک سی ہیں اور ان سب میں نام نہاد انسانی بنیادوں پر مداخلت کا نعرہ لگایا جاتا ہے۔ مداخلت کار کہتا ہے کہ ہم یہ سب نہیں کرنا چاہتے لیکن ہمیں وہاں آباد لوگوں کے لیے یہ کرنا پڑتا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ یہ ایک طرح سے ہاتھ کی صفائی ہے کیونکہ وہاں سب طرح کے لوگ آباد ہیں جبکہ مداخلت کا مقصد ان میں سے ایک کی مدد ہے۔ اور اس سے بھی بڑا مقصد مغربی مفادات کا حصول ہے۔ یہ مفادات تزویری بھی ہو سکتے ہیں، اقتصادی بھی اور سیاسی بھی۔ جہاں تک افغانستان کا مسئلہ ہے تو انہوں نے انسانی بنیادوں پر مداخلت کا ڈرامہ بھی نہیں کیا۔ یہ واضح طور پر انتقام کی جنگ تھی اور اس کا مقصد امریکی عوام کو ٹھنڈا کرنا تھا۔ میں وسط نومبر میں کینیڈا میں کینیڈا ٹیلی ویژن پر چارلس کراتھمر کے ساتھ ایک مباحثہ میں شریک تھا۔ میں نے کہا کہ یہ جنگ انتقام کی جنگ ہے۔ کہنے لگا اگر ایسا بھی ہے تو اس میں کیا حرج ہے۔ بے لچک لوگ اور خاص طور پر جو

MashalBooks.com

حقیقت پسند بھی ہیں اس بات کو کھلم کھلا مانتے ہیں۔ امریکہ نے ان مقاصد کے لیے ضروری حربوں میں مہارت حاصل کر لی ہے اور اس میں ذرائع ابلاغ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

کس طرح؟

◻ پہلی جنگ خلیج کے دوران صحافیوں نے خبروں کے سیاسی منتظمین کو چیلنج کر دیا اور کہا کہ وہ ان واقعات کی سرکاری نہج کو قبول کرنے کو تیار نہیں۔ لیکن بلقان اور اب دہشت گردی کے خلاف جنگ کے دوران لگتا ہے کہ صحافیوں نے بھی سرکاری فکر کو تسلیم کر لیا ہے۔ صحافی لندن کی وزارت دفاع یا واشنگٹن کے پینٹا گون میں جاتے ہیں، سنتے ہیں اور بغیر کوئی سوال کیے مان لیتے ہیں۔ لگتا ہے کہ زیادہ تر صحافیوں کو حکومتی جنگی کوششوں پر کوئی اعتراض نہیں۔ وہ واقعات کا دیا گیا انداز مان لیتے ہیں۔ سوویت ذرائع ابلاغ سے متمیز رہنے کے نظریاتی خطوط بھلا دیئے گئے ہیں۔ نیو یارک کی جوڈتھ ملر با آسانی برزنیف عہد کے پراودا اخبار کی سینئر نامہ نگار بن سکتی ہے۔

معروضی کوریج کے لیے انفارمیشن اور تعلیم کے متبادل نیٹ ورک ناگزیر ہو چکے ہیں۔ انٹرنیٹ واقعی ایک قیمتی متبادل ذریعہ کے طور پر سامنے آیا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اس کے بغیر ہم کیا کرتے۔ تقریباً سارے کا سارا ذرائع ابلاغ پانچ چھ بڑی کمپنیوں کے پاس ہے اور خبروں کے آزاد ذرائع ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ٹونی بلیئر بہت نمایاں رہے۔ ان کے جوش وخروش کی کیا وجہ ہے؟

◻ بلیئر یہ سب کچھ توجہ حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ وہ ایک بڑی سلطنت کے حکمران ہیں حالانکہ وہ شمالی یورپ میں واقع درمیانے درجے کے ایک ملک کے وزیر اعظم ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کلنٹن نے انہیں بخوشی استعمال کیا تھا لیکن بش انتظامیہ نے شروع میں ان پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ البتہ بعد میں وہ نئی سامراجی جارحیت کا اہم حصہ بن گئے۔ میرا خیال ہے کہ وہ تیسرے درجے کے ذہن کے حامل دوسرے درجے کے اداکار ہیں۔

نوم چومسکی نے نکتہ اٹھایا ہے کہ آئرش ریڈ آرمی کا مالی نیٹ ورک زیادہ تر بوسٹن اور نیو یارک

میں ہے لیکن برطانیہ وہاں بم نہیں گراتا؟

□ میرا خیال ہے کہ نوم ٹھیک کہتا ہے۔ لیکن اس نکتے سے بھی تو یہی پتہ چلتا ہے کہ برطانیہ اب سامراجی قوت نہیں رہا اور امریکہ ہی سامراجی قوت ہے۔ اب سلطنت صرف ریاست ہائے متحدہ کو کہا جا سکتا ہے۔ یہ اس وقت کی واحد سلطنت ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ جنگ نیٹو کی اعلیٰ کمان کے تحت نہیں ہو رہی۔ اسے ایک طرف کر دیا گیا ہے۔ دہشت گردی کے خلاف اتحاد کا دوسرا نام امریکہ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی حکمت عملی میں کسی طرف سے کوئی مداخلت نہ ہو۔ جب جرمنی نے دو ہزار سپاہیوں کی پیشکش کی تو رمز فیلڈ نے کہا کہ اس نے ایسی کوئی درخواست نہیں کی تھی۔ اس کے منہ سے یہ کھلم کھلا بیان بہت عجیب لگا تھا۔

ایک حالیہ مضمون میں آپ نے دسویں صدی کے سیکولر عرب شاعر ابوالعلی المعری کی ایک نظم کا حوالہ دیا تھا:

''دربار میں سے گزرتی ہوا سرسراتے ہوئے کہتی ہے کہ یہی وہ باجبروت بادشاہ تھا جس نے کبھی کمزور کی سسکیاں نہیں سنی تھیں۔''

ذرا اس کمزور کی آواز کے متعلق کچھ کہیے۔

□ کمزوروں کی سسکیوں سے میری مراد نوآزادانہ پالیسیوں کا شکار ہونے والوں کی سسکیاں ہے۔ اور دنیا میں ایسے لوگ کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے وطن چھوڑے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو افریقہ سے یورپ جانے والے جہازوں کے نیچے پیٹ کے ساتھ چمٹ جاتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے وہ اپنی موت کی پروا بھی نہیں کرتے اور ان میں اکثر موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کی یہ مایوسی گلوبلائزیشن کا نتیجہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا کمزور لوگ کبھی اپنے آپ کو اتنا منظم کر سکیں گے کہ اپنی حالت بدل سکیں یا کبھی اس قابل نہیں ہوں گے؟ کیا کمزور اندرونی طور پر اتنی سیاسی طاقت حاصل کر سکیں گے کہ وہ کبھی حکمرانوں کو چیلنج کر سکیں؟ لوگوں میں یہ احساس بڑھتا جا رہا ہے کہ گلوبلائزیشن کے حالیہ دورانیے میں خود جمہوریت کچلی جا رہی ہے اور یہ بھی کہ سیاست ایک لغو شے ہے۔ اور کوئی تبدیلی نہیں لا سکتی۔ عالمگیر سطح پر یہ ایک خطرناک صورتِ حال ہے۔ کیونکہ جب ایسا ہوتا ہے تو دہشت گردی شروع ہو جاتی ہے۔ دہشت گردی کمزوری ہی سے جنم لیتی ہے، طاقت سے نہیں

اور یہ مایوسی ہی کی مظہر ہوتی ہے۔
المعری ایک عظیم متشکک شاعر تھا۔ اس نے قرآن مجید کی پیروڈی لکھی تھی۔ اس کے دوست اسے چھیڑا کرتے تھے، ''لیکن، المعری! تمہارے ''قرآن'' کی تلاوت کوئی نہیں کرتا۔'' وہ جواباً کہتا، ''ہاں، مگر مجھے وقت دو۔ اگر لوگ بیس برس اسے پڑھتے رہیں تو یہ بھی اتنا ہی مقبول ہو جائے گا۔'' وہ اسلام کا اچھا دور تھا؛ اس میں لوگ کسی بھی اتھارٹی کو چیلنج کر لیتے تھے۔ ہم جس دنیا میں سانس لے رہے ہیں وہ اس سے بہت مختلف ہے۔ اب مسلمان بھی بیشتر پروٹسٹنٹ پیورٹنز کی طرح روحانی ظاہر بین بن گئے ہیں اور محض لفظوں میں الجھ کے رہ گئے ہیں۔ وہ اسلامی تاریخ کے بارے میں حقیقت پسندانہ مباحث سے گریز کرتے ہیں اور فوراً بنیاد سے رجوع کرتے ہیں۔

> اور آج کی دنیا میں امریکہ دہشت گردی کے خلاف ایک طویل جنگ کی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔ وہاں کچھ اس قسم کی باتیں سنائی دے رہی ہیں کہ یہ جنگ دس یا پندرہ برس تک جاری رہے گی۔ اور یہ کہ اس میں ساٹھ تک ملک شامل ہو سکتے ہیں۔ بش انتظامیہ ہمیں تقریباً روزانہ یاد دلاتی ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ ابھی ابتدائی دور میں ہے۔ اس سے کیا مراد ہے؟ اور اس کا کیا مقصد ہے؟

□ اس کا اہم ترین مقصد دنیا کے نقشے کو امریکی پالیسی اور مفادات کے مطابق نئے سرے سے ترتیب دینا ہے۔ قدرتی وسائل محدود ہیں اور امریکہ اس امر کی یقین دہانی چاہتا ہے کہ اس کی آبادی کو یہ وسائل میسر رہیں۔ چنانچہ اس کا پہلا کام یہی ہوگا کہ دنیا کے تیل پیدا کرنے والے خطوں پر کنٹرول حاصل کر لے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ جنگ تیل کی خاطر چھیڑی گئی۔ میں اس پر یقین نہیں رکھتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ جنگ خطے میں امریکی معیشت کے غلبے کے لیے استعمال نہیں ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ تیل کو اس میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔
مشرق وسطیٰ میں امریکہ کا ایک بڑا مسئلہ ہے کہ عراق اور شام شروع ہی سے اسرائیل کے لیے خطرہ بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور عراق کے پاس تیل کے بہت بڑے ذخائر ہیں۔ سفاک ہنری کسنجر نے بھی ایک بار کہا تھا ''ہم عربوں کو تیل پر قابض کیوں رہنے دیں''۔ چونکہ اسرائیل اس خطے میں امریکہ کا مرکزی اتحادی ہے تو ظاہر ہے کہ امریکہ اس کے طاقتور

مخالفین کو کمزور کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہی مقصد حاصل کرنے کے لیے عراق پر حملہ کیا گیا، اور شام پر بھی حملے کا امکان ہے۔ یہ پالیسی اپنے بنانے والوں کے لیے بے حد خطرناک ہے۔ کیونکہ اس میں عام لوگوں کے ردعمل کو بالکل نظرانداز کیا گیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عوامی ردعمل کا لاوا پھٹ سکتا ہے؟ تو آپ دیکھیں گے کہ سعودی عرب جیسے ممالک بھی متاثر ہوں گے۔ اگر سعودی عرب کا شاہی خاندان اتار پھینکا گیا تو کچھ لوگ واویلا کریں گے۔ لیکن اگر ان کی جگہ امریکہ کی حمایت یافتہ یا اقوام متحدہ جیسی امریکی لبادہ اوڑھے حکومت آ گئی تو کیا معاملات سدھر جائیں گے؟ اس طرح متحدہ امارات جیسے بدعنوان سلطان بھی ٹکڑوں میں بٹ جائیں گے۔ پھر امریکہ کیا کہے گا۔ کیا اسرائیلی اس سارے خطے میں تیل کے محافظوں کا کردار ادا کریں گے؟ اس کے نتیجے میں مستقل گوریلا جنگ شروع ہو جائے گی۔ تو پھر کیا امریکی اور یورپی اس خطے کی حفاظت کریں گے؟ اس کا نتیجہ بھی لمبی گوریلا جنگ ہی کی صورت میں نکلے گا۔ یہاں حکومت کرنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ لوگوں کی ایک کثیر تعداد کو قتل کر دیا جائے۔

عراق کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں؟

□ الگ تھلگ رہنے کی نئی پالیسی سے جی لبھانے کے بعد اب امریکہ یہ فیصلہ کرنے کے درپے ہے کہ وہ پوری دنیا کو چلائے گا تو اسے کھل کر پوری دنیا سے کہہ دینا چاہیے کہ ... ''ہم دنیا کی واحد سامراجی طاقت ہیں اور ہم سب پر حکومت کریں گے، اور اگر تم اسے پسند نہیں کرتے تو تمہیں اس کی سزا بھگتنا پڑے گی۔'' امریکی سامراجیت ہمیشہ سے ایک ایسی سامراجیت رہی ہے جو سامراجیت کہلانے سے خوف زَدہ تھی۔ مگر اب وہ کھل کر سامنے آنے کا آغاز کر رہی ہے۔ اور ایک طرح سے یہ اچھی بات ہے تاکہ ہمیں معلوم تو ہو کہ کہاں جھکنا ہے اور کہاں کورنش بجالانا ہے۔

MashalBooks.com